لے کے ناں میں سوہنڑے رب دا کراں کلام بیان
مہر محبت کرنے والا اُچا اُسدا ناں

ریـــــگِ رواں

گندھارا ہندکو اکیڈمی پشاور

ریگِ رواں

شاعر

فریدعرش

جملہ حقوق بحق گندھارا ہندکو اکیڈمی محفوظ ہیں

نام کتاب	ریگِ رواں
شاعر	فرید عرش
کمپوزنگ	محمد نعمان قیوم
سیٹنگ	علی اویس خیالؔ
سرورق	ثاقب حسین
سال اشاعت	2017ء
اہتمامِ اشاعت	محمد ضیاء الدین، چیف ایگزیکٹو کمیٹی، جی ایچ اے
جی ایچ اے اشاعت حوالہ	F.218/17
قیمت	300 روپے
پرنٹنگ	جی ایچ اے لیزر پرنٹنگ پشاور
مطبع	گندھارا ہندکو اکیڈمی پشاور
ISBN No.	978-969-687-227-6
ملنے کا پتہ	گندھارا ہندکو اکیڈمی، 2 چنار روڈ، آبدرہ، یونیورسٹی ٹاؤن پشاور

گندھارا ہندکو اکیڈمی پشاور

2۔ چنار روڈ، آبدرہ، یونیورسٹی ٹاؤن، پشاور

091-9216223,9216224

www.gandharahindko.com

انتساب

اُن کی اہلیہ زبیدہ خاتون کے نام

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	ریگ رواں کا شاعر (سید سعید گیلانی)	7
۲	پشاور کا چاند (ارشاد احمد صدیقی۔امریکہ)	10
۳	تعارف (افشاں چشتی)	13
۴	تاثرات (اہل خانہ)	16-17
۵	فائل فوٹو (خواجہ غلام فرید عرشؔ)	18
۶	کلام	22-191
۷	پنکھڑیاں	192-196

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ریگ رواں کا شاعر

میں نے 1965ء میں ایڈورڈ کالج پشاور سے گریجویشن کی ڈگری لی تو اُس وقت پشاور کی ادبی فضاء بڑی توانا تھی اُردو ادب کے بڑے نام جو بعد میں اور بھی بڑے ہوئے پشاور میں آب وتاب سے چمک رہے تھے مثلاً احمد فراز، محسن احسان، خاطر غزنوی، جلیل ہاشمی، اشراف حسین احمد، مسعود انور شفقی، مختیار علی نیر، رضا ہمدانی، مرزا محمود سرحدی، روشن نگینوی، طہ خان، اشرف بخاری اور میرے اُستاد محترم جناب فارغ بخاری بزرگوں میں فراز کے والد آغہ برق کوہاٹی، لعل شاہ جگر، کوکب سرحدی، امداد حسین بیگ، ابوالکیف کیفی دوسری طرف ہندکو زبان کے اُستاد غلام رسول گھائل، ہندکو کے بے مثل شاعر آغہ محمد جوش اور لالہ مزمر تاتاری کا شہرہ تھا۔ اسی فضاء میں فرید عرش بھی نہ صرف سانس لے رہا تھا بلکہ غزل کی آبیاری میں مصروف تھا۔

کریم پورہ بازار میں فارغ بخاری صاحب کا کلینک تھا جہاں شام کو مریضوں سے زیادہ شاعروں کا رش ہوتا تھا۔ میں چونکہ اُستاد کی خدمت میں حاضری دینے جاتا وہیں فرید عرش سے ملاقات ہوئی۔ اور پھر گہری شناسائی ہوگئی۔ اُن دنوں پشاور میں انجمن بازی بھی بڑی زوروں پر تھی ہر ہفتے پندرہ دن بعد کسی نہ کسی صاحب ذوق کے ہاں تنقیدی نشست ہوتی تھی یہ بات شاید آج کل مہنگائی نے مشکل کردی ہے۔ یا ادب کا ذوق وشوق کم ہوگیا مجھے بھی انجمن ترقی اُردو کے سیکرٹری کا اعزاز ملا۔ اوروں کے علاوہ فرید عرش کے ہاں بھی یہ سلسلہ چلتا رہا۔ فرید نہ صرف ایک اچھی فیملی سے تعلق رکھتا تھا بلکہ شرافت کا پتلا تھا، پارٹی بازی سے دور صرف ایک شاعر تھا۔ فارغ صاحب کے کلینک پر آتا تو خاموش بیٹھا رہتا تھا یا پھر مطلب کی بات کر کے چپ ہو جاتا تھا۔

بات ''ریگِ رواں'' کی کرنی ہے جو فرید کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ جوش ملیح آبادی فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے کلام کا جائزہ لینا ہے تو اُسی فضاء کو مدنظر رکھنا ضروری ہے جس فضاء میں وہ شاعری کی گئی ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ اس بات سے اتفاق نہ کریں مگر وہ دور جس میں عرش نے غزل کہی کلاسیکی اعتبار سے مکمل تھا مگر اتنا سائنٹفک نہ تھا جتنا بعد میں ہوا اور غزل گل وبلبل اور محبوب سے باتیں کرنے کے علاوہ دوسرے مضامین سے آراستہ ہونے لگی۔ جیسے احمد فراز کا یہ شعر؛

جب اُس سے ملنا تو مبہم سی گفتگو کرنا
پھر اپنے آپ سے سو سو وضاحتیں کرنی

یا فارغ بخاری کا یہ شعر

کچی کلیاں پکی فصلیں سر چھپائیں گی کہاں
آگ شہروں کی لپک کر آگئی ہے گاؤں میں

عرش کا کلام پڑتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اُس کی شاعری میں غم ذات زیادہ موجود ہے مگر اُس نے غم دوراں کی بھی بات کی مگر اُتنی بے باکی سے نہیں کی جتنی آج کے دور میں ہوتی ہے مگر پھر کہیں کہیں جستہ جستہ اُن محرومیوں کا احتجاجی احساس ملتا ہے۔ جو اُس دور میں لاحق تھیں بہر حال شاعر نے اُنہیں کسی نہ کسی پہلو سے سامنے لانے کی کوشش کی ریگ رواں ایک خوبصورت مجموعہ کلام ہے جسے منظر عام پر لانے کیلئے گندھارا ہندکو اکیڈمی کے ارباب اختیار مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اُمید کامل ہے اسے جو بھی پڑھے گا میرے خیال سے سو فیصدی نہ سہی کسی نہ کسی حد تک اتفاق کرے گا اور اس شاعری سے محظوظ ہوگا۔ آخر میں عرش کے چند اشعار نمونے کے طور پر موجود ہیں۔

میں ہر اک دل کی صدا ہوں لیکن
میری آواز جدا ہے سب سے

گرتی ہوئی دیوار کے جاں خوردہ شجر تھا
دیکھی ہے جہاں چھاؤں وہیں بیٹھ گیا

تم مجھ سے اُجالوں کا پتہ پوچھ رہے ہو
عرصہ ہوا میں اپنے ہی سائے سے جدا ہوں

دم سحر بھی وہی ظلمتوں کے سائے رہے
لہو تھا اپنا اُجالے مگر پرائے رہے

خود کو پہنچانتا انسان اگر
مسجدیں ہوتیں نہ مندر ہوتے

شجر کے سائے سمجھ کر بڑھے تھے جن کی طرف
قریب پہنچے تو پرچھائیاں سلیب کی تھیں

(سعید احمد گیلانی)
30 دسمبر 2017ء

پشاور کا چاند

وہ خطۂ زمین جس نے دونوں باہیں کھول کر اپنے بیٹوں بیٹیوں کو کلیجے سے لگائے رکھا۔ فانوس بن کر ان کی حفاظت کی۔ مادری زبان میں ان کو لوریاں دیں، نازک آبگینے کی طرح رکھوالی کی۔ دھوپ کی تمازت اور جاڑوں کی یخ بستہ راتوں میں ان کے تحفظ کے سامان کیے۔ چشم بینا سے ان کی پرورش کی ان کو سجا کر سنوار کر اپنے قدموں پر کھڑا کیا۔ وفاداری، وفا شعاری اور احترام کا درس دیا۔

یوں لگتا ہے وہ خطۂ زر میں معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ حرمت اور احترام سے لبریز لیل و نہار دھیرے دھیرے دھواں بن رہے ہیں لیکن ابدی محبت کے چراغ نہاں خانہ دل میں بدستور روشن ہیں۔ حال ہی میں میرے مہربان دوست عتیق صدیقی (چوتھا درویش) نے جناب ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کا کالم پڑھ کر اُسے دل سے لگایا، پڑھا اور بار بار پڑھا' صبر کے سارے بندٹوٹ گئے اور اُن کے قلم نے وطن سے جدائی اور بے دست و پائی کی دُہائی دی ان کا کالم بھی روزنامہ آج میں طبع ہوا۔ وطن سے دور جس پشوری نے یہ کالم پڑھا چشم نم سے پڑھا ایک مٹتی ہوئی معتبر تہذیب کا نوحہ کیا' بچپن اور نوعمری کے بے فکرے دنوں کو یاد کیا۔

غم روزگار نے ہمیں کہاں کہاں دربدر رکھا۔ وطن ہم سے جدا ہو گیا ہمارے درمیان سالوں اور میلوں کے فاصلے گراں تا گراں پھیل گئے۔ لیکن ہم بدستور سانس پشاور کی فضا میں لیتے ہیں' اور پشاور کے چاند کو تکتے رہتے ہیں اور پشاور ہمارے سانسوں مں آباد رہتا ہے۔ ہمارے مرحوم دوست جوہر میر (دوسرا درویش) کا شعر یاد آ رہا ہے۔

مجھے شہر سے وہ بدر کرے تو عجیب نہیں
میرا شہر مجھ سے بدر کرے تو پتہ چلے

وہ پشاور جس کا ذکر ''آج'' کے کالموں میں ہوا۔ یہ وہی وقت تھا جب ہم نوعمری کے منہ زور دنوں میں پشور ہی میں تھے اور پشاور کے دلبر یا کوچوں کے کوچہ گرد تھے۔ کتابوں کا مطالعہ سے زمین میں ادب کا شعور انگڑائیاں لے رہا تھا جستجو اور لگن تھی کہ پشاور کے ان لکھاریوں کو قریب سے دیکھیں ان کی محفل میں بیٹھیں۔ ان کی گفتگو سے فیض یاب ہوں جن کا نام ہمارے پاکستان مں روشن ہے جن کا اخباروں میں چرچا

ہے ریڈیو پاکستان جن کی موجودگی کے بغیر تہی دامن ہے اور پھر سوچتے۔

وہاں جو جائیں گرہ میں مال کہاں؟ فرید عرش سے تھوڑی سی ملاقات تھی ایک شام ڈرتے ڈرتے انجمن ترقی اُردو کے اجلاس میں شرکت کیلئے پہنچ گئے جوان دنوں روزنامہ انجام کے بالا خانے پر منعقد ہوتا تھا ایک اجنبی کی طرح پچھلی قطاروں میں بیٹھ گئے اجلاس میں سید ضیاء جعفری، فارغ بخاری، رضا ہمدانی، احمد فراز محسن احسان، مرزا محمود سرحدی، مظہر گیلانی، خاطر غزنوی جیسے معروف احباب پشاور کے چاند کی طرح جگمگا رہے تھے۔ فرید عرش انجمن کی سیکرٹری تھے جو شاعری بھی کرتے تھے افسانے بھی لکھتے تھے اور انجمن ترقی اُردو کی کاروائی ایک جہازی سائز کے رجسٹر میں درج کرتے تھے لکھنے والوں میں ہر دل عزیز تھے ان کی دُکان بازار بٹیر بازاں میں تھی جس میں مرزا محمود سرحدی آ کر بیٹھتے تھے اور رونق محفل تھے اس دُکان میں چائے کا کاروبار کم اور شعر و شاعری زیادہ ہوتی تھی راہ گیر ایک لمحہ ٹھہر کر مرزا محمود کے تازہ قطعہ کی ردیف سن کر تعریف کرتے اور اپنی راہ لے لیتے فرید عرش قہوے کا آڑ ڈر دیتے، شمیم بھیروی آتے ہی ہنس کر کہتے ''یار عرش قہوے کا آرڈر دیا ہے یا میں جا کر لے آؤں'' مجید شاہد حلیمی سے کہتے ''ساتھ ہی لے آتے تو کیا ہرج تھا''۔ عارف ندا اپنی دُکان چھوڑ کر قہوہ نوشی کیلئے جاتے، تاج سعید کاغذوں کا پلندہ بغل میں دابے وقت پر آ جاتے، مرزا محمود با آواز بلند کہتے کوئی نیا گیت، تاج سعید؟ تاج سعید کہتے ابھی سناتا ہوں، آپ توجہ سے گیت سنتے اور تاج سعید کی ہندی زبان میں ان کی تعریف کرتے، مرزا محمود اُنہیں گلے لگا لیتے مرزا محمود سرحدی نے تاج سعید کی گیتوں کی کتاب کا نام ''گیتا جلی'' رکھا ہوا تھا۔

ایک روز فرید عرش کی دُکان پر جانے سے قبل ہم نے چائے والے کو قہوے کا آرڈر دے دیا ہمارے وہاں پہنچنے سے چند ہی لمحوں میں قہوہ آ گیا۔ فرید عرش نے تعجب سے کہا ''یہ کس نے آرڈر دیا ہے'' ہم نے اعتراف جرم کر لیا فرید عرش مسکرا کر بولے ''دیکھو آئندہ ایسا نہ کرنا جب ہم قہوے کا آرڈر دیتے ہیں تو ساتھ اپنی دُکان کی عمدہ چائے کی پڑیا بھی دیتے ہیں'' مجید شاہد نے کہا چلو جانے دو بچہ ہے سمجھ جائے گا مرزا محمود سرحدی بولے وہ قہوے والا چینک میں چائے کے ہمراہ بھونے ہوئے چنوں کے چھلکے بھی شامل کر کے اُبالتا ہے اور ہم بے خبر پی کر خوش ہو لیتے ہیں۔ فرید عرش کی دُکان کو صادق کمیشن ایجنسی نمبر ۲ بھی کہا جاتا تھا صادق کمیشن ایجنسی قصہ خوانی بازار میں افغان بلڈنگ کے نیچے ہوا کرتی تھی جس کی ابتداء عتیق احمد صدیقی کے دادا جناب لالہ وزیر صدیقی نے کی تھی اور اب نام کامیاب تھا جہاں پاکستان ہندوستان کے ادبی رسالے اور اخبارات کے ڈھیر

پڑے رہتے تھے۔اورشہر کے سارے ادیب کھڑے کھڑے رسالوں کی مفت روگردانی کرتے تھے جن میں احمد فراز محسن احسان ، خاطر غزنوی، جلیل حشمی ، تاج سعید تو گویا مستقل نظر باز تھے لیکن ڈاکٹر مظہر علی خان ، ن۔م۔دانش زیدائے بخاری ڈاکٹر طاہر فاروقی بھی رسالوں کو ایک نظر دیکھ لیتے۔

لالہ وزیر صدیقی پشاور کی جانی پہچانی اور باغ و بہار شخصیت تھی جن کی مٹی کا قرض عتیق احمد صدیقی کے سر ہے جو اُنہوں نے جلد چکانا ہے۔لالہ وزیر صدیقی اور صادق کمیشن ایجنسی پر بھرپور تبصرہ پشاور کی کالم نگاری کو مکمل کر دے گا تو بات ہو رہی تھی صادق کمیشن ایجنسی نمبر ۲ کی۔فرید عرش ان سارے رسالوں، کتابوں کو احتیاط سے الماری میں سجاتے تھے۔تا کہ سندر ہے اور آنے والوں کے کام آئے۔یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سوائے ان رسالوں کے جن کے فرید عرش خریدار تھے۔باقی رسالے وہ شاعر اور ادیب لاتے تھے جن میں اُن کی کوئی چیز شائع ہو چکی ہو۔وہ دانستہ طور پر وہیں چھوڑ جاتے تھے کہ دوسرے احباب ان کے کلام سے فیض یاب ہو سکیں۔فرید عرش کی دُکان شام کو دوسرا روپ دھار لیتی۔مجید شاہد اور عارف ندا ترنم سے اپنی غزلیں سناتے۔فارغ بخاری اور رضا ہمدانی بھی آ جاتے۔جب پشاور کا چاند دکانوں کے سایہ بانوں سے نکل آتا تو دُکان بند ہو جاتی اور دور جام کے رسیا اسی دُکان کے تھڑے پر بیٹھ کر ایک اور قہوے کا آرڈر دیتے۔اور چائے والے سے کہتے قہوہ ہمارے تختہ کلب پر بھجوانا۔(دُکان کا تھڑا دُکان بند ہو جانے کے بعد تختہ کلب کہلاتا تھا)۔اور حسب معمول مرزا محمود سرحدی براجمان تھے دوسرے احباب بھی جمع تھے تاج سعید بھی آ گئے مرزا محمود کا تاج سعید سے ء خاص لگاؤ تھا۔تاج سعید کے آتے ہی مرزا محمود نے پوچھا تمہیں ریڈیو پاکستان کے مشاعرے کا دعوت نامہ مل گیا ہے؟ تاج سعید نے لاعلمی کا اظہار کیا اور پوچھا کہ آپ کو دعوت نامہ کب ملا ہے۔ مرزا محمود سرحدی نے اپنی واسکٹ کی جیب سے ریڈیو پاکستان کا دعوت نامہ نکالا اور پرزے پرزے کر کے ہوا میں اُڑا دیا اور کہنے لگے۔اگر ریڈیو والوں نے میرے یار کو نہیں بلایا تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔

ادائے مطلب دل ہم سے سیکھ لی جائے　　اُنہیں سنا ہی دیا جائے داستاں کی طرح

ارشاد احمد صدیقی (امریکہ)

کالم، روزنامہ آج

21 فروری 2011، بمطابق 17 ربیع الاول 1432ھ

تعارف

خواجہ غلام فرید عرش، میرے پیارے نانا، میرے آغا جان، سن 14 اکتوبر 1925ء کو گڑواڑہ گھرانے میں پشاور کے حسین شہر میں پیدا ہوئے۔ آغا جان کا گھرانہ پشاور کے معزز ترین گھرانوں میں جانا جاتا تھا اور آج بھی شہر کے معززین میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ محلّہ ڈھکی شریف میں اُنہوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے بہترین دن گزارے۔ آغا نے ایف اے تک تعلیم پائی اور بتاتے تھے کہ بچپن سے ہی اُنہیں اُردو لٹریچر سے بے حد دلچسپی تھی اور اسی دلچسپی نے اُن کے اندر موجود ایک بہترین شاعر و ادیب کو کھوجنے میں اُن کی مدد کی۔ اُنہوں نے سن 1950ء کی دہائی میں اپنی شاعری کا آغاز کیا اور نہ صرف مشاعروں میں بحیثیت شاعر شرکت کرنا شروع کی بلکہ خود اپنے گھر کی بیٹھک میں کئی مشاعرے منعقد کیے۔ اُن کی شاعری اور ناول اُس وقت کے اعلیٰ پائے کے اخبارات و رسائل مثلاً نقوش، لوح و قلم، امروز لاہور اور دیگر میں شائع ہوئے۔ ادب کے دلدادوں نے آغا جان کی ان صلاحیتوں کو سراہا اور یوں پشاور اور گردونواح کے ادبی حلقوں میں اُن کی منفرد پہچان بنی۔ آغا جان کے شاعر دوستوں میں احمد فراز، خاطر غزنوی، فارغ بخاری، شمیم بھیروی، محسن احسان، سعید گیلانی، فیض الرحمان فیضی کے نام قابل ذکر ہیں۔ آغا کہ یہ دوست نہ صرف اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کے معترف تھے بلکہ اکثر اُنہیں اپنا دیوان شائع کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔

فارغ بخاری نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ادبیاتِ سرحد میں آغا جان کو ایک ترقی پسند شاعر کے طور پر متعارف کروایا۔ اسی کتاب میں فارغ بخاری صفحہ نمبر ۶۴۶ میں آغا کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں۔

''عرش خاموش سے نوجوان ہیں۔ محفل میں بہت کم بولتے ہیں۔ چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھلی رہتی ہے اور چپ چاپ بیٹھے دوسروں کی باتوں سے محفوظ ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن جب کبھی بولیں تو کوئی معرکے کی بات کریں گے۔ ایسی بات جو ساری محفل کو چونکا دے۔ یہی عالم اُن کی شاعری کا بھی ہے۔ وہ چھوٹی بحر میں کم سے کم الفاظ میں بڑی بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

آغا کی شاعرانہ زندگی پر گزشتہ صفحات میں اُن کے ساتھی سعید گیلانی صاحب تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔ جس کیلئے میں اُن کی تہہ دل سے مشکور ہوں۔ مگر اُن کی زندگی کے دیگر پہلوؤں پر روشنی ڈالنا

بھی ضروری ہے۔ادب اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے افراد اکثر اپنی ادبی دلچسپیوں کے باعث روزگار پر دھیان نہیں دے پاتے۔آغا کے والد کو بھی اسی بات کا ڈر تھا اور چونکہ آغا ایک فرمانبردار بیٹے تھے اسی لیے اپنے والد کے اوہام دور کرنے کو اُنہوں نے اپنی ادبی مصروفیات کو کم کیا اور روزگار پر دھیان مرکوز کیا اور جلد ہی اُس میں بھی اپنے قدم مضبوط کر لیے۔یوں اُنہوں نے یہ ثابت کیا کہ نہ صرف وہ ایک منجھے ہوئے شاعر ہیں بلکہ ایک محنتی انسان بھی ہیں جو اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو نبھانے کے گُر سے بھی آشنا ہیں۔

آغا نہ صرف ایک فرمانبردار بیٹے، رازدار بھائی اور ملنسار دوست تھے بلکہ ایک بہت محبت کرنے والے شوہر بھی تھے۔ہم نے کبھی آغا جان کو آپا جان سے اُونچی آواز میں بات کرتے، محفل میں اختلاف کرتے یا کوئی ایسی بات کرتے نہ سنا جس سے آپا کے احترام میں کوئی حرف آئے۔ہم نے اُن دونوں کو ایک دوست کی طرح باتیں کرتے پایا۔سن 2000 کی بات ہے جب اچانک آپا کو فالج کا اٹیک ہوا اور اُسی سال آغا کی آنکھوں میں موتیا اُترنا شروع ہوا۔

ان دونوں کی بیماری نے جہاں ہم سب کو انتہائی افسردہ کر دیا وہیں اُن کے درمیان ان بیماریوں نے فاصلے بھی بڑھا دیئے۔کیونکہ سال بھر کے عرصے میں ہی آپا فالج کے باعث اپنی گویائی اور آغا موتیا کے باعث اپنی نظر سے محروم ہو گئے۔ڈھائی سال کی علالت کے بعد آپا جان کی وفات نے آغا کو اور بھی تنہا کر دیا۔اپنی وفات تک آغا اُنہیں کثرت سے یاد کرتے۔

آغا جان نے اپنی زندگی کے آخری پندرہ سال نظر سے مکمل محرومی میں گزارے مگر اس ظاہری بے نوری نے آغا جان کی نفیس طبیعت میں کوئی فرق نہ ڈالا۔وہ ہمیشہ سے ہی ایک متحرک انسان تھے اور ہمہ وقت کسی نہ کسی کام میں مشغول نظر آتے نظر کے جانے کے بعد بھی آغا نے کسی پر بوجھ بننا مناسب نہ سمجھا۔اپنے اندازے سے چلتے، کسی کا ہاتھ پکڑ کر چلنا اکثر گوارہ نہ کرتے گویا خودمختاری کو ہمیشہ مقدم جانا۔اپنے بیشتر کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے۔اُن کی سب ادویات اُن کے بستر کے سرہانے لیدر کے باکس میں سلیقے سے رکھی رہتیں اور اپنے ہاتھوں سے چھو کر بتا سکتے کہ دوا کا کون سا پتہ اُن کے ہاتھ میں ہے۔مہمان نواز تھے ہر آنے والے کی تواضع سرہانے رکھی عجوہ کھجور، ڈرائی فروٹ اور برفی سے کرتے، بستر سے اُٹھتے تو اپنے ہاتھوں سے بستر کی شکنیں دور کرتے اور ہم جو مدد کو آگے بڑھتے تو ہم کو روک لیتے۔ایک وقت کی نماز پڑھتے ہی دوسرے وقت کی نماز کی فکر میں لگ جاتے کہ کہیں قضا نہ ہو جائے۔

صبر کرنا مشکل کام ہے مگر شکر کے ساتھ صبر کرنا انتہائی مشکل، ہم نے ساری زندگی آغا کو کبھی شکوہ کرتے نہ پایا۔ اُن کے آخری ایام میں بھی جو بات تسلسل سے اُن کی زبان پر رہتی وہ یہی تھی کہ ''شکر، شکر، اللہ تیرا شکر'' ۔ حوصلے، ہمت، خوش مزاجی اور شکر کے ساتھ زندگی کی مصیبتوں پر صبر کرنے کا ہنر میں نے آغا جان سے ہی سیکھا۔

میں اکثر و بیشتر اُن کو دیوان شائع کرنے پر قائل کرنے کی کوشش کرتی۔ جواب میں وہ ایک ہی بات کہتے کہ ''اچھا میرے مرنے کے بعد تم ہی میری شاعری کا مجموعہ شائع کرنا، یہ کام تمہارے ذمے''۔

آج سے ایک سال قبل 21 اکتوبر 2016 کو آغا جان چند ماہ کی بیماری کے بعد شکر گزاری کے ہی عالم میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ ہم سب کی زندگی کا لازمی جزو تھے۔ اور اُن ہی کے دم سے ہمارا ننھیال آباد تھا۔ ہم سب آج بھی اُن کی کمی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

میں گندھارا ہندکو اکیڈمی کی تہہ دل سے مشکور ہوں کہ آغا جان نے جو ذمہ داری میرے سپرد کی تھی اُسے پورا کرنے میں انہوں نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ محمد ضیاء الدین صاحب نے جس طرح اس سارے معاملے میں اپنی دلچسپی ظاہر کی اور معاونت کی وہ بے حد قابل ستائش ہے جس کیلئے ہم سب ان کے ممنون ہیں۔

پیارے آغا جان آپ کے دیوان کی اشاعت ہم سب کیلئے باعث فخر ہے اور خوشی کا موجب بھی مگر یہ خوشی دو چند ہوتی جو آپ اپنی زندگی میں ہی اپنے دیوان کی اشاعت کی اجازت دیتے۔ میری دُعا ہے کہ آپ کا دیوان اُردو ادب کے بہترین حوالوں میں سے ایک حوالہ بنے اور اُردو زبان کی ترقی میں اپنا کردار ادا کرے۔ اللہ آپ کو اپنا اور اپنے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاص الخاص قرب عطا کرے۔ آمین

افشاں چشتی

نواسی

نومبر 2017ء

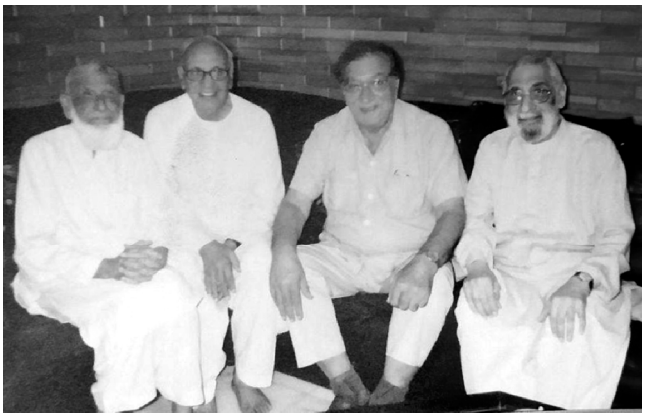

فریدعرش کا نامور شعراء احمد فراز اور محسن احسان کے ساتھ ایک یادگار فوٹو

وہ ایک ایماندار شخص تھے، ساری عمر اُنہوں میں ہمیں رزق حلال کی نصیحت کی۔ وہ نہ صرف ایک نے باپ بلکہ ایک اچھے دوست بھی تھے۔ اُن کی وفات سے ہم ایک دُعا گو بزرگ سے محروم ہو گئے۔

'' منجھلا بیٹا محمد ثاقب ''

آغا جان اور میرے والد صاحب میں ادب سے دلچسپی ایک قدر مشترک تھی۔ ان کی ذاتی لائبریری سے ادبی رسالے، ان کا ذاتی کلام پڑھنے سے میرے ادبی ذوق کی تسکین ہوئی۔ اسی طرح آغا اور ایک انگریز شاعر John Milton میں بھی ایک قدر مشترک تھی۔ آغا بھی Milton کی طرح اپنی عمر کے درمیانے حصے میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے مگر اللہ سبحانہ تعالیٰ سے شکوہ نہیں کیا۔ اپنے سانٹ On his Blindness میں ملٹن نے کہا ہے کہ جو لوگ آزمائش میں صبر سے کام لیتے ہیں وہ بھی اپنا کام کر رہے ہیں۔ "They also serve who only stand and wait" اللہ تعالیٰ آغا جان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

''بہو : صائقہ ثاقب ''